جناب فصیح الدین (پی ایس پی)*
معروف دانشور، ادیب وکالم نگار

# چند اوراقِ کتب چند بزرگوں کے خطوط

## مکتوباتِ مشاہیر پر بے لاگ تبصرہ

ملکۂ سبا کے زمانے میں یہ کام ہُد ہُد سے لیا جاتا تھا۔ جب کبوتر کے تنِ نازک میں شاہین کا جگر پیدا ہوا تو یہ ذمّہ داری ''کبوتر جا جا جا'' پر آن پڑی۔ لیکن زبانِ غیر سے شرحِ آرزو پر جب آوازیں اُٹھنے لگیں تو قاصد کو ڈھونڈا گیا تا کہ خط کے ساتھ ساتھ محبوب یا مخاطب کے رنگِ حیائی کی خبر بھی لیتا آئے۔ مکتوب نگاری ایک ایسا فن اور صنف سخن بن گیا کہ غالبؔ قاصد کے آتے آتے خط ایک اور لکھ کے رکھ دیتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جواب میں کیا کچھ لکھا گیا ہوگا؟ یہ سلسلہ اس قدر مسلسل اور لامتناہی بن گیا کہ مرنے کے بعد غالبؔ کے گھر سے حسینوں کے خطوط بوریوں کے حساب سے نکلے۔ یہ منظر جب جناب مولانا سمیع الحق اور ان کے والد شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ کے ہاں دیکھنے میں آیا تو پتہ چلا کہ تصویرِ بُتاں ہیں نہ حسینوں کے خطوط۔ البتہ خطوط کا ایک ایسا انبار نکل آیا کہ مولانا کو زندگی ہی میں غالبؔ کے شعر میں ترمیم کرنا پڑی ؎

چند اوراقِ کتب، چند بزرگوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

میری نظر میں '' مشاہیر بنام عبدالحق و سمیع الحق'' خطوط کا مجموعہ نہیں ''قاموسِ مکتوبات'' (Encyclopedia of Letters) ہے۔ خطوط لکھنا ہمارے پیارے پیغمبر حضرت سرور کائناتؐ کی سُنت اور خلفائے راشدینؓ کا طریقہ بھی تھا۔ مومنانہ، فاسقانہ، صوفیانہ، عاشقانہ وغیرہ قسم کی شاعری کی طرح خطوط بھی ہر طرح کے ہو سکتے ہیں۔ سرونسٹن چرچل اور نپولین کے خطوط جو وہ اپنی محبوباؤں کو میدانِ جنگ سے بھی لکھتے رہے، انسانی جذبات واحساسات کا نمونہ ہیں۔ کانگرس لائبریری واشنگٹن

---

* مدیر اعلیٰ ریسرچ لائبریری بالمقابل فاٹا سیکرٹریٹ پشاور

میں نیچے کتابوں کی چھوٹی سی دکان میں جہاں مختلف ممالک کی مقامی کہانیوں کی چھوٹی چھوٹی کتابیں دیکھیں وہاں امریکی صدور کی اپنی بیٹیوں کے نام خطوط کی کتاب بھی نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ امریکی صدور فارغ نہ بھی ہوں تو اپنے بچوں کو راہنمائی کے لیے خط لکھنے کے لیے وقت نکال ہی لیتے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اندرا گاندھی کے نام جو خطوط لکھے ہیں وہ بھی اب کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ مغربی مصنفین بھی خطوط نویسی کو بہت اہم سمجھتے ہیں مثلاً نوبل انعام یافتہ مصنف ہمنگوے کے منتخب خطوط۔ ہمنگوے نپولین کے خطوط کی تعریف کرتا اور اپنے خطوط کو ''بے مزہ'' اور ''احمقانہ'' کہتا تھا۔ حالانکہ ایسا تھا نہیں۔ ہماری اسلامی تاریخ میں تصوف کا بہت بڑا حصّہ ملفوظات کے بعد خطوط کی شکل میں ہے جیسا کہ مکتوباتِ امام ربانیؒ، مکتوباتِ خواجہ معصومؒ، مکتوباتِ شاہ ولی اللہؒ، مکتوبات صدی اور دو صدی (شیخ شرف الدین یحیٰ منیریؒ) وغیرہ۔ ماضیٔ قریب کے ہندوستانی علماء میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا یعقوب نانوتویؒ اور قاری محمد طیّبؒ اور اُن کا حلقۂ فکر اصلاحِ نفس کے لیے ''مکاتیب'' کا طریقہ اپنائے ہوئے تھے۔ بعض علماء جو تصوف کے ساتھ ادب و سیاست سے بھی لگاؤ رکھتے تھے، کے خطوط میں اجماعِ ضدّین کا رنگ نمایاں ہے۔ سید سلیمان ندویؒ، مناظر احسن گیلانیؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے مشاہیر کے خطوط اس نوعیت اور رنگ کے ہیں۔ اقبال کے خطوط جناح کے نام اور پھر مکاتیبِ اقبال کا پورا سلسلہ فکر و سیاست اور قدیم و جدید مباحث کا پتہ دیتا ہے۔ غالبؔ کے خطوط جسے بہت سے لوگوں نے مرتب کیا، کسی نے حواشی چڑھائے اور کسی نے فارسی سے ترجمہ کیا، اپنی مثال آپ ہیں۔ مولانا غلام رسول مہرؒ نے بھی مرتب کیے اور پھر کئی جلدوں میں خلیق انجم نے بھی۔ خود مولانا غلام رسول مہرؒ کے خطوط پر مختار عالم حق نے حواشی لکھنا شروع کیے۔ مشفق خواجہ کے خطوط اور شبلی کے خطوط میں اگر خالص علمی و ادبی رنگ ہے تو یہ سلسلہ داؤد رہبر کے ''سلام و پیام'' میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ابوالکلام آزادؒ کے خطوط تو بہر حال ایک ایسا شاہکار بن گئے کہ ''غُبارِ خاطر'' نام پایا۔ یہ تاریخ لذیذ بھی ہے اور طویل بھی۔

خطوط کو جمع کرنا، ترتیب دینا اور پھر اس پر متعلقہ مقامات پر حواشی سے وضاحت کرنا کہ وہ وقت، وہ زمانہ، وہ شخصیت، اور وہ واقعہ کیا تھا، خاصی دلسوزی اور دماغ سوزی کا کام ہے۔ اس کے لیے فکر و نظر کی وسعت کے ساتھ ساتھ غیر جانبداری، وسعتِ قلبی اور برداشت بھی درکار ہوتی ہے۔ تحقیق و

تنقید میں اعتدال وتوازن کا دامن پکڑنے یا چھوٹنے سے مؤلف ومرتب کی شخصیت کا اعتدال خود بخود سامنے آجاتا ہے۔ کبھی کبھی خطوط کو کوئی ایک فرد یا ادارہ جمع کرنے کا بیڑہ اُٹھاتا ہے جیسے جامشورو یونیورسٹی کے مجلّہ ''تحقیق'' کا مکاتیب نمبر یا ''نقوش'' کا ''خطوط نمبر'' اور ''مکاتیب نمبر''۔ غیر مطبوعہ اور نایاب خطوط حواشی کے ساتھ شائع کرنے میں ادبی اور علمی رسائل اکثر پیش پیش رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ خطوط چونکہ زیادہ تر ذاتی ہوتے ہیں اس لیے ان کو ایک جگہ جمع کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ اگر یہ خطوط کسی ایک شخص یا ادارے کے نام ہوں تب بھی ستر اسّی سال تک ان خطوط کو ایک ترتیب سے رکھنا اور پھر اُن کو کئی جلدوں میں حواشی کے ساتھ شائع کرنا اور بھی مشکل کام بن جاتا ہے۔ پہلے پہل زیرِ نظر خطوط حضرت مولانا عبدالحقؒ کے نام آتے رہے اور جب ماہنامہ ''الحق'' جاری کیا گیا تو پھر ایک ادارہ اس کی ترتیب وتدوین کا ذمہ دار ٹھہرا۔ میں نے انجمن ترقی اُردو بورڈ کراچی میں جب مشاہیر کے ان خطوط کی تفصیل ڈاکٹر جاوید منظر اور پروفیسر سحر انصاری کے سامنے بیان کی تو وہ عش عش کر اُٹھے۔ فون پر مجلسِ ترقی ادب کے ڈائریکٹر پروفیسر تحسین فراقی نے بھی یہی تبصرہ کیا کہ ہماری تاریخ اور جدید دینی ادب کا ایک بیش بہا خزینہ ہاتھ آیا ہے۔ پروفیسر سحر انصاری جیسے نابغۂ روزگار مصنف نے بتایا کہ میں ہندوستان میں یہ بات کئی سال پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہندوستان میں اُردو کا مستقبل ہمارے ہندوستانی دینی مدارس سے وابستہ ہے جو اُردو کو ایک علمی اور ادبی زبان کے طور پر ہندوستان میں زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہ وہی بات ہے جس کو ان مشاہیر کے خطوط میں فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے سامنے ممتاز نقاد حسن عسکری نے کہی تھی کہ ''اگر اُردو کا معیاری نثر پڑھنا ہے تو وہ اکوڑہ خٹک سے شائع ہونے والے الحق رسالہ میں آپ کو مل سکتا ہے''۔ (جلد دوم۔ص۔ 75) ''الحق'' کا اشاریہ جو راقم کو مولانا عبدالقیوم حقانی کی وساطت سے ملا ہے، حسن عسکری کی اس بات کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

جدید دینی ادب جس کے معماران میں ابوالکلام آزادؒ، ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا مودودیؒ اور ان کے ہم فکر رفقا کا نام جلی حروف سے لکھنے کے مترادف ہے، صرف ایک دینی جماعت یا طبقے کو محدود نہیں ہے۔ دیوبند کے اکابر یا ان سے وابستہ افراد نے اس سلسلے میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں وہ آہستہ آہستہ تحقیقی مقالات کی صورت میں سامنے آرہے ہیں۔ ان خطوط میں جگہ جگہ ادبیات کے

اسلامی تصور پر بھی مشاہیر کی آراء ملتی ہیں۔مولانا علی میاںؒ نے مصنوعی اور تقلیدی ادب، مصنوعی اور غیر مصنوعی ادب اور پیشہ ور ادیب یا بہرو پیے کی بحث چھیڑ کر ایک نئی راہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے(جلد دوم۔ص۔38)۔مشاہیر کے یہ خطوط جس کی تقریب رونمائی 2011ء میں ہوئی متواتر ارتقائی عمل سے گزر رہے ہیں۔چھٹی اور ساتویں جلدیں جنوری 2012ء کو منظر عام پر آئیں۔آخری جلد میں تقریبِ رونمائی کی تقاریر اور تحسین وآفرین کے مضامین بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ساتویں جلد جو جہادِ افغانستان کے بارے میں ہے کے آخر میں ان تمام مضامین کا اشاریہ دیا گیا ہے جو''الحق'' میں 1969ء سے لے کر 2011ء تک افغانستان سے متعلق شائع ہوئے ہیں۔علمائے کرام اور تاریخِ افغانستان کے محققین کے علاوہ ان میں طالبان راہنماؤں اور جنرل اسلم بیگ کے مضامین خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔سات سو سے زائد صفحات پر مبنی یہ جلد جدید تاریخِ افغانستان کے بارے میں بہت سے واقعات وحوادث اور نظریات وافکار کے بارے میں ایک مستند وستاویز ہے جس سے ایک خاص نقطۂ نظر کے بارے میں آگاہی ملتی ہے۔مثال کے طور پر اعجاز الحق نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ'' مسلمانوں نے جب تک اپنے افغان مجاہدین کو اپنے سینے سے لگا کر رکھا اللہ تعالیٰ نے پاکستان کے اوپر برکتیں نازل کیں اور کوئی آٹے کا بحران نہیں آیا'' (جلد ہفتم۔ص۔422) بائیں بازو کے لوگ ان ''برکات'' کو شاید ''ڈالروں کی بارش'' سے جوڑ دیں۔امریکی صدر اوبامہ کی افغانستان پاکستان (Af-Pak) پالیسی سے تقریباً دس سال پہلے ڈاکٹر اسرار احمد نے مؤلف کے نام اپنے خط میں کیسی عجیب بات لکھی ہے کہ''پاک افغانستان دونوں ایک ہو جائیں۔یک جان دو قالب ہی نہیں بلکہ یک جان اور یک قالب بن جائیں اور مجھے اُمید ہے کہ ایسا لازماً ہوگا'' (جلد دوم۔ص۔238) کیا یہ جملہ آج کے حالات میں انسان کو حیرت میں مُبتلا نہیں کرتا؟ چھٹی جلد میں عالمِ اسلام اور بیرون ممالک کے مشاہیر، سیاسی راہنماؤں اور سفارت کاروں کے خطوط کو یکجا کیا گیا ہے۔ان خطوط میں عالمِ عرب کو خصوصی طور پر یاد رکھا گیا ہے اور ان کا حصّہ زیادہ ہے۔سعودی عرب اور اس کے حکمرانوں سے وابستہ توقعات کا نمایاں طور پر پتہ چلتا ہے۔شاہ فیصل شہیدؒ اور خادم الحرمین شریفین شاہ فہدؒ کی وفات حسرت آیات پر حواشی تبصرے اور خطوط''یادرفتگاں'' میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔دلچسپی کی بات یہ نظر آئی کہ شاہ فہدؒ کے جنازے میں جانے کے لیے صدر جنرل پرویز مشرف مولانا سمیع الحق کو خصوصی طیارے

میں ساتھ اس لیے گئے کہ مولانا کے نظریات کا قبلہ درست ہو اور ان کی ''برین واشنگ'' ہو سکے مگر طرفہ تماشا یہ ہوا کہ مولانا نے جنازے میں جنرل پرویز مشرف کو غلط سمت میں کھڑے دیکھ کر ان کا قبلہ درست کیا۔ مولانا کو ڈر رہا کہ کہیں کوئی کیمرے کی آنکھ جنرل مشرف کو دیکھ نہ لے کہ ان کا تو قبلہ ہی غلط تھا (جلد ششم۔ ص۔ 50) ۔کمال یہ ہے کہ اسی جلد میں مسلمانانِ عالم کی ایران سے متعلقہ توقعات کا بھی بھرپور ذکر ہے۔

خطوط میں سفرناموں کا احاطہ بھی عجیب لطف پیدا کر رہا ہے۔ مولانا اور اُن کے رفقائے سفر کو تہران میں سُنّی علماء نے بتایا کہ ''دونوں فرقے ایران میں خوش اسلوبی سے وقت گزارتے ہیں'' (ص۔ 267)۔ ایران میں شیعہ سُنی فساد اور باہمی جھگڑے کے نہ ہونے کا خصوصی ذکر ہے۔ البتہ مولانا اور ان کے ساتھیوں کو ایرانی کھانوں میں مرچ مصالحوں کی کمی کی شکایت ضرور رہی ہے۔ مولانا نے کانفرنسوں کے حال احوال کے ساتھ اپنی سفری یادداشتیں جس انداز سے مختصراً لکھی ہیں جیسا کہ ''امام مسلمؒ کے دیس خراسان (ایران) میں چند روز'' اگر ان کو وسعت دی جاتی تو مولانا تقی عثمانی کے علمی سفرناموں کی طرح ایک اور علمی سفرنامہ ہمارے ہاتھ آجاتا جس میں سفر کا حال کم اور تاریخِ اسلام کے شاندار ماضی اور موجودہ زبوں حال پر رونا زیادہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات مؤلف کے کوئی دوست یا دارالعلوم کے کسی عالم نے بھی بیرون ملک سفر کے دوران کوئی خط لکھا ہے تو وہ بھی ایک مکمل سفرنامہ کی شکل اختیار کر چکا ہے جیسا کہ مولانا شیر علی شاہ کا مکتوبِ بغداد (جلد چہارم۔ ص۔ 1212)۔ خود مؤلف کے اپنے والد کے نام خطوط میں عمرے اور حج کی تفصیلات بھی ایک علمی سفرنامے سے کم نہیں۔ ایک کانفرنس کے اختتام پر اتحادِ ملّت کا جو نقشہ مختلف مکاتبِ فکر کے 31 علماء نے تیار کیا تھا وہ بائیس نکات کا ضابطۂ اخلاق (جلد ششم۔ ص۔ 295) تو آج بھی اپنے عمل پذیر ہونے کو ترس رہا ہوگا۔ محسوس ہوتا ہے حکومتی پالیسیوں کی طرح اتحاد بین الملّت بھی صرف کاغذی کارروائی تک محدود رہتا ہے۔ ان ''خطوط کے قاموس'' میں البتہ مستقبل کے مؤرخ اور نقاد کے لیے اِس قسم کی کارروائیاں محفوظ کر لی گئیں ہیں کہ مخصوص حالات کے پیدا ہونے پر مختلف طبقوں اور حلقوں کا کیا ردِّعمل تھا؟

مشاہیر کے ان خطوط کا جائزہ کسی ایک مضمون میں نہیں سمایا جا سکتا۔ ان خطوط اور ان کی مختلف جہات پر الگ الگ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھنے چاہیئے۔ اس مختصر مضمون میں میں چیدہ چیدہ

نکات کا بیان کروں گا۔ سب سے پہلی تحقیق طلب بات تو یہ ہے کہ پون صدی تک ان خطوط کو کیسے جمع کر کے محفوظ کیا جا سکتا ہے؟ یہ کہانی اس مجموعے میں صرف اتنی بیان کی گئی ہے کہ ابھی مؤلف کے کھیلنے کودنے کے دن تھے اور سن یہی آٹھ نو کا تھا کہ خطوط کی ایک زنبیل ان کے والد کے نام کتابوں سمیت آتی تھی۔ پیغام رسانی کے دوسرے جدید ذرائع ابھی انسان کی فکری ایجاد میں لوٹ پھوٹ رہے ہوں گے۔مولانا پیشِ لفظ میں اس کا ذکر یوں کرتے ہیں: ''یہ خطوط میرے بچپن کے ذوق وشوق کا پہلے پہل سامان بن گئے بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ دوات کی روشنائی کی خوشبو، قلم کی روانی کا نغمہ، صریرِ خامہ کا بانکپن اور رنگ برنگ لفافوں اور خطوط کی چمک دمک گویا میرے گھٹی میں شامل ہوگئی تھی''۔ لاشعوری کے زمانے میں اپنے باپ کے سرہانے سبز رنگ کے مخملی تھیلے کو للچائی نظروں سے دیکھنے والا بچہ شعور کی زندگی میں اُسے عقیدت سے دیکھنے لگا۔ نتیجہ اس ''قاموس مکاتیب'' کی صورت میں نکلا۔ پون صدی کے اس جزم واحتیاط اور نظم وضبط کے مظاہرے نے ہندوستانی علماء کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے جن کا عمومی خیال اس خطے اور پختون قوم کے بارے میں یہ ہوتا ہے کہ شاید نظم وضبط (ڈسپلن)، ترتیب اور مینجمنٹ پختونوں کو چھو کر بھی نہیں گزری۔ مولانا نے اس خیال کی ایسی تردید کی ہے کہ خود مولانا محمد تقی عثمانیؒ جیسے محتاط عالم کو اس کا اظہار کرنا پڑا ہے۔ اس کہانی اور جمع مکاتیب میں زمانے کے اُتار چڑھاؤ بھی آئے ہوں گے جن کے بیان سے یہ خطوط خالی ہیں۔ البتہ پیش لفظ سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ 2010ء میں پختونخوا میں جو خطرناک اور تباہ کن سیلاب آیا اور دارالعلوم حقانیہ کی حدود میں بھی پانی پہنچ گیا تو مولانا باقی تمام چیزیں اور مال واسباب چھوڑتے ہوئے صرف ان خطوط اور اس کے ساتھ کے کمپیوٹر کو دارالعلوم کی ایک بلند عمارت کی چھت پر لے گیا کہ کہیں یہ قیمتی اثاثہ ضائع نہ ہو۔ پشتو کہاوت ہے کہ جب گھر تک بات آ پہنچے تو صرف اپنی خیر منانی چاہیئے مگر مولانا صاحب نے اسلاف کی ان یادگار خطوط کو بچانا ضروری اور مقدم سمجھا۔ اُردو زبان وادب اور تاریخ اسلام و پاکستان کے لیے ان کی یہ خدمت اور یہ جذبہ اس لائق ہے کہ ان کو اس کارنامے پر بجا طور پر پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی جا سکتی ہے۔ عوام اس کا اندازہ نہیں کر سکتے مگر مجھ جیسے تاریخ وادب کے طالب علم یہ بات جانتے ہیں کہ یہ کام بڑے بڑے ادارے نہیں کر سکتے جو ایک شخص کے بچپن کے کھیلونوں سے شروع ہو کر میدانِ جنگ کی تلواروں تک علم وفضل کی تلاش وحفاظت کے جذبے نے ممکن بنایا ہے۔ اس کہانی

کے کئی اہم موڑ پون صدی کے انسانی اور تاریخی واقعات و حوادث پر مبنی ہوں گے جس پر ایک تحقیقی مقالہ لکھنے کی ضرورت موجود رہے گی۔

دوسری اہم بات یہ کہ ان خطوط میں ہندوستان و پاکستان کے اندر بر پا ہونے والی دینی و سیاسی تحریکات کا بہت زیادہ ذکر ملتا ہے۔تحریکِ ختم نبوت سے دفاع پاکستان کونسل تک کتنی ہنگامہ خیز تحریکات بر پا ہوئیں وہ ان سات جلدوں میں جگہ جگہ دل کے ٹکڑوں کی طرح بکھری ہیں۔ یہ خطوط انہی تحریکات اوران سے وابستہ شخصیات وقوانین کا ایک ایسا دستاویز ہے جس پر اُٹھائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے کا مصرعہ پوری طرح صادق آتا ہے۔بعض شخصیات کے بارے میں عام قاری کوعلم نہیں ہوتا کہ وہ کس درجے کا عالم یا ذاتی طور پر کس قسم کے اخلاق کا مالک تھا۔ یہ کام مؤلف نے حواشی میں سرانجام دیا ہے۔حواشی میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ مؤلف نے کسی کا دل عمداً دُکھانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اگر مولانا غلام غوث ہزارویؒ کی شخصیت پر تفصیلی حواشی لکھے ہیں (جلد پنجم۔ص۔1790) تو حیات محمد خان شیر پاؤ کی بھی تعریف کی ہے۔ (جلد اول۔ص۔183)۔مخالف حلقۂ فکر کے مشاہیر کا ذکر بھی انتہائی محتاط انداز سے کیا ہے۔لفٹنٹ جنرل اعظم خان کے ایک طویل اور ملکی حالات پر ایک پُرسوز خط کے آخری کلمات کچھ اس طرح ہیں:’’میں پورے خلوص، دل سوزی اور حب الوطنی کے جذبے کے ساتھ یہ گزارش کروں گا کہ یہ وقت ذاتی اناؤں کی پرورش کا نہیں کیونکہ اگر خُدانخواستہ، خُدانخواستہ یہ ملک نہ رہا تو نہ کسی کی وزارت رہے گی اور نہ ان کی جرنیلی رہے گی۔انہیں بھی لندن کے کسی ہوٹل میں ہیڈ ویٹر کی ملازمت ڈھونڈنی ہوگی‘‘(جلد اول۔ص۔112) مولانا نے حواشی میں اس شخصیت کا ذکر نہیں کیا ہے کہ لندن کے کس ہوٹل میں ان کو ہیڈ ویٹر کی ملازمت کرنی پڑی۔معلوم نہیں یہ مولانا کی طبعی شرافت کا نتیجہ ہے یا اس بات کا اقرار ہے کہ اس ملک میں کئی اضلاع میں ڈپٹی کمشنر رہنے والی یہ شخصیت صدرِ پاکستان بھی رہ چکے ہیں۔ پھر بھی ان کے ریٹائرمنٹ کی ذاتی زندگی میں گزر اوقات کے لیے کچھ نہ تھا۔لوگ اس ذہین اور نابغۂ روزگار صدر پاکستان جنرل سکندر مرزا کو کچھ بھی کہیں،بعض لوگ ان کی عظمت کی گواہی دیں گے کہ اس نے ہوٹل میں ویٹر بننا گوارا کیا، قدرت کی تقسیم پر تسلیم و رضاء کا مظاہرہ کیا مگر کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا اور نہ ہی ملازمت کے بعد کسی بیرون ملک کے وطن دشمن اداروں اور این جی اوز میں کنسلٹنٹ بنا۔مولانا سے اپیل ہے کہ اگلے ایڈیشن میں

ان پر بھی ایسا ہی ایک حاشیہ لکھیں جیسا کہ اپنے مایۂ ناز شاگرد اور سیاست میں میرے ممدوح مولانا فضل الرحمان صاحب پر لکھا ہے۔ (جلد پنجم۔ص۔ 1838) افسوس کہ مولانا فضل الرحمان کے تمام تر خطوط دارالعلوم میں طلباء کے داخلوں سے متعلق ہیں۔ وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے تھے۔ مولانا نے حواشی میں اگر چہ بہت زیادہ وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا ہے البتہ مولانا مودودیؒ کا ایک عدد خط جو قادیانیوں کے بارے میں ایک استفسار کے جواب میں لکھا گیا ہے کے نیچے حاشیہ مولانا مودودیؒ کی شخصیت سے زیادہ جماعت اسلامی کے بارے میں ہے۔ میری نظر میں اس حاشیہ اگر اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کی کیا جائے تو مناسب ہوگا اس لیے کہ مولانا کی شخصیت، علمیّت اور تحریروں پر اِن خطوط میں جا بجا ذکر کیا گیا ہے اور جماعت اسلامی کی سیاست خصوصاً جس دور کے بارے میں مؤلف نے لکھا ہے مولانا مودودیؒ سے بہت بعد کی باتیں ہیں۔ جماعت اسلامی والے تو اپنا دفاع خود کریں گے البتہ مولانا مودودیؒ کی عالمانہ شان اور جرأت کے بارے میں یہ حاشیہ زیادہ نہیں جچتا۔ (جلد دوم۔ص۔61)

ان خطوط میں ایک مزے کی چیز مشاہیر کے قلمی معرکے ہیں۔ مولانا مدار اللہ مدار کے خطوط (جلد پنجم۔ص۔2012) اور ہندوستان کے خان غازی کابلی کے خطوط (جلد سوم۔ص۔ 774) اس کا نمونہ ہیں۔ ایک نہیں درجنوں مشاہیر کے خطوط میں کسی علمی کتاب کا محاکمہ ہے یا کسی مضمون کے مندرجات پر تنقیدی رائے کا اظہار ہے۔ ان قلمی معرکوں میں کئی علمی و تاریخی مباحث کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ ان پر مستقل مضامین لکھنے کی ضرورت آج بھی موجود ہے۔ مثال کے طور پر باچا خان مرحوم سے متعلق ابوعمار قریشی کا خط (جلد دوم۔ص۔85)، نظریۂ پاکستان اور بانی پاکستان سے متعلق ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کے خطوط (جلد دوم۔ص۔80)۔ پروفیسر محمد اسلم کا قاضی عبدالحلیم اثر افغانیؒ کی لغزش پر خط کہ کیا شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، ابوالکلام آزادؒ اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ حسنی سیّد تھے یا ان کا سادات سے حسب و نسب کا کوئی واسطہ نہیں ہے؟ یا پروفیسر محمد اسلم کا یہ سوال اُٹھانا کہ کیا مولانا عبدالماجد دریا بادی قادیانیوں کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے؟ (جلد دوم۔ص۔254) محمد اعظم علی خان خسروی کا اقبالؒ پر زبردست قلمی حملہ اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی خاموشی بھی خاصا معرکے کی چیز ہے (جلد دوم۔ص۔322) یہ پون صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں۔ ہر جلد میں اس قسم کے مناظرانہ اور معاصرانہ معرکوں اور چشمک پر مبنی درجنوں خطوط کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ ''الحق کے قلمی معرکوں'' کے نام سے ان خطوط کی روشنی میں متعلقہ

مضامین سمیت کم از کم کوئی ایم فل کا مقالہ لکھا جا سکتا ہے جو خود ایک معرکے کی چیز ہو گی۔

ایک اور مزے کی چیز کتابوں پر تبصرے ہیں۔ اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ عبدالرشید ارشد کی طرف سے ''بیس بڑے مسلمان'' پر تبصرہ میں سرقہ اور علمی بد دیانتی کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں (جلد پنجم۔ص۔ 1812)۔ بعض اوقات مکتوب نگار نے کسی اہم مسئلے پر کتاب لکھنے کی ضرورت محسوس کی تو ''الحق'' کی وساطت سے یہ سوال اُٹھایا کہ اس اہم موضوع پر تحقیقی کام کی ضرورت ہے جس سے ظاہر ہے کہ علما اور مصنفین کو ایک تحریک ملتی ہو گی جیسا کہ قاری فیاض الرحمان ہزاروی کی 1971ء سے تادمِ اشاعت 37 عدد خطوط کا تمام تر محور علمی اور سوانحی کتابوں کا تذکرہ ہے۔ (جلد پنجم۔ص۔ 1867)۔ یا پروفیسر داکٹر محمد یوسف فاروقی کے خطوط (جلد پنجم۔ص۔ 2209)۔ کیسی عجیب بات ہے کہ این جی اوز کے موجودہ شور شرابے سے 34 سال قبل ڈاکٹر محمد یوسف نے یہ دہائی دی کہ اسلام میں بچوں کی قدر و قیمت، حقوق اور تعلیم و تربیت پر مزید لکھا جائے۔ ان کا مضمون اس بارے میں ''الحق'' میں چھپ چکا تھا۔ بعض کتابوں پر تنقیدی خطوط بھی اہم ہوتے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر فضل الرحمان کی کتاب پر ڈھاکہ سے 1968ء میں مولانا محی الدین کا خط (جلد پنجم۔ص۔ 2005)۔ بعض اوقات مصنفین نے اپنی کتابیں ارسال کرتے ہوئے خطوط بھی لکھے ہیں جیسا کہ مشہور عالم محقق فضل احمد عارف کے خطوط کہ آج اگر اُن کی کتابیں بازار سے دستیاب نہ ہوں پھر بھی پڑھنے والے کو ان کے بارے میں معلوم ہو جاتا ہے۔ (جلد پنجم۔ص۔ 1835) خطوط کے اس عظیم الشان مجموعے سے گویا ''کتابیات'' کا ایک دبستان کھُل جاتا ہے۔ بعض اوقات خطوط میں بڑے معرکۃ الآراء مضامین پر فقیہانہ بحث ملتی ہے جیسا کہ قاضی عبدالکریم کلاچوی کے خطوط اور بالخصوص خط نمبر 51 جو خودکش حملوں کی شرعی حیثیت کے بارے میں ہے (جلد چہارم۔ص۔ 1576) اور بعض میں بڑے تاریخی مباحث سمٹ آئے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے خطوط (جلد سوم۔ص۔ 709)۔ جہاد افغانستان کا ذکر تو ایک الگ جلد میں ہے البتہ مولانا بشیر احمد شاد کا اگست 1999ء کا خط کتنا چشم کشا ہے جب کہ مکتوب نگار مسلمانوں کو بروقت خبردار کیا تھا کہ امریکہ طالبان، افغانستان اور اسامہ بن لادن پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ (جلد دوم۔ص۔ 488)۔

خطوط میں ذاتی گپ شپ ، بیماری اور عیادت کے احوال، کتابوں اور تحفے تحائف کی رسیدیں تو ہوا کرتی ہیں۔ خطوط اُس وقت ایک اور طرح کا علمی شہ پارہ بن جاتے ہیں جب اس میں

پورے کے پورے سوالنامے درج کیے جائیں۔ان خطوط میں جگہ جگہ ایسے سوالنامے ملتے ہیں جن سے مشاہیر کے نزدیک اہم مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر قبلہ آیاز (حالیہ وائس چانسلر، اسلامیہ کالج یونیورسٹی) نے ایک خط مسلمانوں میں اتحادو اتفاق سے متعلق سوالات پر مؤلف کو بھیجا تھا۔ایک سوالنامہ بطور خط سینیٹر پروفیسر خورشید احمد (جماعت اسلامی والے) نے اسلامی مدارس میں اصلاحات کے بارے میں ارسال کیا تھا۔(جلد سوم۔ص۔787) دینی مدارس سے متعلق اس قسم کے بعض سوالات مولانا تقی عثمانی نے بھی اُٹھائے ہیں۔(جلد اول۔ص۔152) کیا یہ سوالات آج بھی تشنہ لب نہیں ہیں؟ کیا ان سوالات کا کوئی جواب ہم سے بن پڑا ہے؟ یہ سوالات کئی سال پہلے بھی اہم تھے اور آج بھی اہم ہیں۔خود مولانا مؤلف کا سوالنامہ ''میری علمی اور مطالعاتی زندگی'' بھی کافی چشم کشا،غور طلب اور پریشان کن سوالات پر مبنی ہے۔ایک سوالنامہ جو میر شکیل الرحمان کی طرف سے ہے بڑا ہی دلچسپ ہے جس میں اسلام میں عورتوں کے کھیل کو دیعنی کرکٹ ہاکی، سوئمنگ یا مردوں کے سامنے کھیل کھیلنے کی شرعی حدود کے احکام دریافت کیے گئے ہیں (جلد اول۔ص۔ 287-286)۔معلوم نہیں ان بارہ سوالات پر مبنی سوالنامے کا کیا جواب دیا گیا تھا مگر یہ شاید اُس زمانے کی بات ہو جب آتش جوان تھا اور پسینے سے گلاب کی خوشبو آتی تھی۔موجودہ دور کے اخبارات اور ٹی وی چینلز اور ''میرا سلطان'' جیسے ڈرامے دیکھنے کے بعد اس قسم کے سوالناموں کی کوئی زیادہ ضرورت نہیں رہی ہے کہ غلامی میں بدلتا ہے قوموں کا ضمیر

خطوط کے اس قاموس کی ترتیب حروفِ تہجی کے اعتبار سے حفظ مراتب کے نہ رکھنے کے الزام سے حفاظت کے طور پر کی گئی ہے۔ ہر جلد کے پیچھے معروف مشاہیر اور مشہور سیاسی راہنماؤں کے نام درج ہیں ۔ یہ کوئی پانچ سو سے زیادہ مشاہیر کے نام ہیں جبکہ اس قاموس میں کل پندرہ سو سے زائد مشاہیر کے خطوط سات ضخیم جلدوں کی ہزاروں صفحات پر پھیلے ہیں۔حواشی کے علاوہ ایک مکتوب نگار کے مضامین اگر ''الحق'' میں شائع ہوئے ہوں تو ان کا حوالہ بھی دیا گیا ہے جیسا کہ مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ (جلد دوم۔ص۔287) اور مولانا غلام محمدؒ (جلد پنجم۔ص۔1817) کے مضامین کی تفصیل۔ دونوں سید سلیمان ندویؒ کے اجل خلفاء تھے۔ یہ اس قاموسِ مکاتیب کا خاص انداز ہے۔بعض اوقات ایسے خطوط بھی شامل کیے گئے ہیں جس میں اچھا خاصا گلہ شکوہ اور تندو تیز انداز بھی ہوتا ہے مثلاً نوابزادہ محمد علی خان ہوتی کا خط جو ''الحق'' کے ایک اداریے سے متعلق ہے ۔ یہ مؤلف کی غیر جانبداری کا ایک نمونہ ہے کہ

اس خط کے ساتھ وہ اداریہ بھی نقل کیا ہے جس سے مکتوب نگار کو شکوہ اور رنج ہوا تھا (جلد پنجم۔ص۔1976)۔قارئین کو خطوط میں درج مباحث کو دریافت کرنے کے لیے آسانی یہ پیدا کی گئی ہے کہ خطوط کے اوپر عنوانات بھی دیئے گئے ہیں اس لیے کسی بھی ایک صاحب کا خط آسانی سے ڈھونڈا جا سکتا ہے۔حوالہ دینے کے لیے مکتوب نگار کے خطوط اگر ایک سے زیادہ ہوں تو باقاعدہ زمانی اعتبار سے اس کو نمبر دیے گئے ہیں اور کسی بھی خط کا حوالہ انتہائی آسان بنا دیا گیا ہے۔تحقیق کے شائقین کے لیے یہ کام جتنا آسان بنایا جا سکتا ہے،مؤلف نے اس میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔

مشاہیر کے خطوط کے نمونے بھی یادگار کے طور پر شائع کیے گئے ہیں۔سب سے پہلا نمونہ شیخ الاسلام حسین احمد مدنیؒ کا ہے۔تبرک اور شہادت دونوں جمع ہوئے ہیں۔بعض خطوط عربی اور بعض پشتو اور انگریزی میں ہیں جن کو من وعن نقل کیا گیا ہے۔کسی کسی جگہ انگریزی اور پشتو خطوط کا ترجمہ بھی دیا گیا ہے مگر یہ کیفیت ہر جگہ یکساں نہیں ہے جس سے ایک گونہ تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔پشتو زبان میں سب سے خوبصورت خطوط حاجی محمد آمین ترنگزئیؒ (جلد اوّل۔ص۔118) اور شیخ الحدیث مولانا امین گل کھوئیؒ برمول (جلد دوم۔ص۔431) کے ہیں۔اول الذکر نے راقم کی والدہ ماجدہ کو قرآن پڑھایا کہ میرے نانا مولانا نذر محمدؒ کے دوست اور شیخ تھے اور مؤخر الذکر سے راقم نے کئی پارے دورۂ تفسیر میں پڑھے اور اکثر ان کے درس میں شامل رہتا تھا۔اپنے پیرومرشد مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ کے خطوط سمیت ان سب مشاہیر کے خطوط دیکھ کر دیر تک میری آنکھوں میں آنسو تیرتے رہے۔ان خطوط سے ایک محقق کئی عالمانہ دفتر نکال سکتا ہے اور کوئی شرارت پسند طالب علم ایک شرارتی کرائم رپورٹر کی طرح کئی گھڑے مردے اُکھاڑ کر کئی زخم تازہ کرسکتا ہے۔میں بھی چاشنی اور لطف کے لیے ایسے درجنوں نکات نکال سکتا ہوں مگر مقصد اِن خطوط کی علمی،تاریخی،تہذیبی،دینی،سیاسی اور ادبی حیثیت کو اُجاگر کرنا تھا جو کہ اس ایک مضمون میں قطعاً نہیں ہوسکتا۔آٹھویں جلد کا انتظار رہے گا۔خوفِ فسادِ خلق سے جو ناگفتنی رہ گئی تھی وہ اب ان خطوط میں پوری آب وتاب کے ساتھ تاریخی دستاویز کی شکل میں موجود ہے۔مولانا مؤلف نے اپنے اشاعتی ادارے مؤتمر المصنفین اکوڑہ خٹک،نوشہرہ سے شائع کیا اور سات جلدوں کی قیمت دو ہزار پانچ سو روپے رکھی جو کہ انتہائی مناسب ہے۔رہے نام اللہ کا۔